© rasailojaraid.com

میں بکثرت دشمنوں کو جلا ڈالنے' برباد کرنے' ان کے مویشی خاص طور پر خوبصورت گھوڑوں اور گائیوں کے حصول' مال و خزانے کو حاصل ہونے کی دعائیں اور دشمنوں (غیر آریہ) کے لیے بددعاؤں کے سینکڑوں کلمات ملتے ہیں۔ یہی نہیں دشمن کو ہلاک کر کے سر قلم کرنے' اس کی کھال کھینچ لینے' ہڈیوں کو توڑنے' کچلنے' ان کے جسم کی بوٹی بوٹی کرنے کی دعائیں ہیں۔ بھاگوت گیتا جو جنگ کے فلسفہ کا سب سے بڑا گرنتھ ہے۔ اس میں سری کرشن کے بھاشن (خطاب) کے ذریعہ لڑنے' قتل و غارت گری' خونریزی پر ابھارنے کی نہایت موثر و بلیغ الفاظ میں تعلیم و تلقین ہے۔ گیتا کے فلسفہ جنگ کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی انسان کے قتل کرنے کو گناہ و جرم سمجھنا اور اس پر رنج کرنا محض جہالت اور دھرم کی حقیقت سے ناواقفیت ہے۔ کیونکہ روح کے لیے جسم کی حیثیت وہی ہے جو جسم کے لیے کپڑے کی کسی انسان کا قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے جسم کے کپڑے پھاڑ دینا۔ جب انسان کو ایک دن مرنا ہی ہے تو اسے قتل کرنے میں کیا برائی ہے۔ نیک و بد کا امتیاز صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو گیانی (عارف) نہیں۔ گیان (عرفان) حاصل ہو جانے پر بد سے بدتر فعل (قتل خونریزی) انسان کے لیے گناہ نہیں رہتا۔ ایک طرف گیتا پوری طرح انسان کو قتل و خونریزی پر اکساتی ہے' دوسری طرف گیتا کے ابواب میں کسی ایک جگہ بھی نہ جنگ کا کوئی بہتر نصب العین و مقصد بتاتی ہے اور نہ جنگ کے آداب و حدود' نہ کوئی اعلیٰ اخلاقی ہدایت۔ گیتا سے زیادہ سے زیادہ جنگ کا جو مقصد معلوم ہوتا ہے وہ ہے حکومت و سلطنت' مال و دولت' ناموری و شہرت کا حصول اور شکست کی بدنامی و ذلت کا خوف۔ یہی حال یہودیوں کی توراۃ کا ہے وہ بھی جنگ کے کسی اعلیٰ مقصد اور اخلاقی ہدایات سے یکسر خالی ہے۔ موجودہ دور میں بھارت زور و شور سے خود کو (اہنسا عدم تشدد و امن) کا پیامبر و معلم ظاہر کر رہا ہے اور جنگ کے حوالے سے الزام تراشی میں (اسلام پر) مغربی میڈیا کا ہمنوا ہے۔ جبکہ وید دھرم میں اہنسا کی تعلیم کہیں موجود نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت نے اہنسا کا تصور بدھ مذہب سے لیا ہے جو ایک زمانہ میں بھارت کی اکثریت کا مذہب تھا۔ مگر ساتویں صدی عیسوی میں ہندومت کے پیروکاروں نے بدھ مذہب کے پیروکاروں کا قتل عام کر کے انہیں بہت معمولی اقلیت میں تبدیل کر دیا۔ بھارت کی تاریخ بتاتی ہے کہ مہاتما بدھ سے لے کر مہاتما گاندھی تک امن و اہنسا کی بات کرنے والے ہر شخص کو مار دیا گیا۔ ہندو مذہب کے جتنے بھی ہیروز ہیں وہ سب ہی جنگ کے ہیرو ہیں۔

اسلام میں جنگ کا مقصد اور نصب العین

ہم تفصیل سے ذکر کر آئے ہیں کہ اسلام سے پہلے دنیا میں ہر قوم و ملک و مذہب کے نزدیک جنگ کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ طاقت ور کی خواہش زر' زمین و زن اور اقتدار کے حصول کے لیے وحشت و بربریت' شقاوت و سنگدلی' قتل و خونریزی اور لوٹ کھسوٹ کا وسیع سلسلہ شروع کر کے کمزور [illegible] سے مٹا دیا جائے یا انہیں غلام بنا لیا جائے۔ یہ تھی اس دور میں جنگ کی حقیقت۔

ایسے حالات میں اسلام نے جنگ کے نظریہ و مقصد' قوانین و ضوابط میں اعلیٰ و ارفع اصلاحات کا علم بلند کیا۔ جنگ کے متعلق اسلام کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ بغیر کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے جنگ و قتال ایک معصیت اور گناہ عظیم ہے۔ ہاں جب دنیا میں ظلم و طغیان پھیل جائے اور خدا کے نافرمان و سرکش لوگ خلق خدا کا جینا دوبھر کر دیں' ان کا امن و راحت چھین لیں تو محض دفع معصرت کے لیے جنگ کرنے کی اجازت بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس مقصد کو ایران کے سپہ سالار رستم کے دربار میں صحابی رسولؐ ربعی بن عامرؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا "ہمارا مقصد یہ ہے کہ انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی بندگی میں اور مذاہب کے ظلم و ستم سے اسلام کے عدل میں' دنیا کی تنگیوں سے نکال کر اس وسعت و فراخی میں داخل کریں۔ اس نظریہ کے مطابق جنگ کا مقصد چونکہ حریف و مقابل کو ختم کرنا یا تباہ کرنا نہیں بلکہ محض اس کے ظلم و طغیان' شر و فساد اور نافرمانی کی طاقت کو ختم کر کے اس کے شر و ظلم کو دفع کرنا ہے۔ اس لیے اسلام یہ اصول پیش کرتا ہے کہ جنگ میں صرف اتنی ہی طاقت استعمال کرنی چاہیے جتنی دفع شر و طغیان کے لیے ناگزیر ہو۔ اس لیے جنگ اور اس کے ہنگامہ کارزار کو ان لوگوں تک متجاوز نہیں کرنا چاہیے جن کا جنگی طاقت اور ظلم و طغیان کے بقاء سے کوئی تعلق نہیں۔ دوسرے بے ضرر طبقات کو جنگ کے اثرات و تباہ کاریوں سے حتی الامکان محفوظ رکھنا چاہیے۔ جنگ کے اس مقصد اور اعلیٰ تصور کو ہر وقت پیش نظر رکھنے کی خاطر اسلام نے جنگ و لڑائی کے تمام رائج الوقت الفاظ چھوڑ کر جنگ کے لیے ایک ایسی اصطلاح پیش کی جو کہ اس کو وحشیانہ جنگ کے تصور سے بالکل الگ کر دیتی ہے اور اسلام کے اعلیٰ و ارفع تصور جنگ پر ٹھیک ٹھیک دلالت کرتی ہے وہ ہے جہاد یعنی کسی مقصد کے حصول کے لیے انتہائی کوشش صرف کرنا مگر کوشش کا لفظ بھی انسانی خیر خواہی و بہبودی کے پورے مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا کیونکہ کوشش نیکی اور بدی دونوں جہت میں ہو سکتی ہے۔ اس لیے اسلام نے جنگ کا اعلیٰ تصور و مقصد ہر وقت پیش نظر رکھنے کے لیے فی سبیل اللہ کی قید لگا دی۔ اب ہر وہ لڑائی جو کسی ملک و قوم کی تسخیر' اقتدار کی ہوس' مال و دولت یا کسی عورت کے حصول' ذاتی عداوت و دشمنی یا شہرت و ناموری کی خاطر ہو وہ جہاد سے خارج ہو گی۔ اسلام کے نزدیک جہاد نہیں کہلائے گی۔ جہاد صرف وہ جنگ ہے جو محض اللہ کی رضا کے لیے ہو' ظلم و شرک کو دفع کرنے کے لیے ہو' جس میں کوئی سی غرض یا خواہش کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔

اسلام کا تصور جنگ و جہاد

جنگ کے اس ارفع اور پاکیزہ تصور کے تحت اسلام نے جنگ کا ایک مکمل ضابطہ اور قوانین وضع کیے جس میں جنگ کے آداب' اخلاقی حدود' محاربین نے جنگ کا ایک مکمل ضابطہ اور قوانین و فرائض مقاتلین و غیر مقاتلین کا امتیاز قیدیوں کے حقوق' مفتوح قوموں کے حقوق نہ صرف تفصیل سے بتائے بلکہ پیغمبر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام ﷺ اور آپ کے خلفاء راشدین نے اپنے عمل سے برت کر اعلیٰ نمونے بھی قائم کر کے ہر دور کے لیے عملی نظائر اور مثال قائم فرمادی۔

بہت سی صحیح احادیث میں بتایا گیا کہ اگر کوئی شخص مال غنیمت کے حصول، فرمانروائی کی خواہش، شہرت و ناموری، اپنی شجاعت کے اظہار، حمیت قومی و ملکی یا جوش انتقام میں لڑتا ہے تو وہ اسلام کے نزدیک ہرگز جہاد نہیں بلکہ وہ شخص خدا کا بدترین نافرمان قرار پائے گا۔ اسلام نے جنگ کی اصلاح و تطہیر کے سلسلہ میں سب سے پہلی اصلاح یہ کی کہ دشمن کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ اہل قتال اور غیر اہل قتال۔ ایک وہ جو جنگ میں عملاً حصہ دار بنتے ہیں یا حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں جیسے جوان تندرست مرد۔ دوسرے وہ جو عرفاً و عقلاً عملی جنگ میں حصہ نہیں لیتے یا عام طور پر حصہ نہیں لیا کرتے جیسے عورتیں، بچے، بیمار، زخمی، اپاہج، اندھے، عبادت گاہوں کے مجاور، کاروبار دنیا سے یکسو رہبان اور ایسے ہی دیگر بے ضرر لوگ۔ اسلام نے جنگ میں صرف اول الذکر طبقہ کو قتل کرنے کی اجازت دی۔ اور ثانی الذکر طبقات کے قتل کرنے کو سختی سے منع کر دیا۔ غرض جو لوگ عادۃً معذور کے حکم میں ہیں یا لڑتے نہیں جنگ میں ان سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ البتہ اگر یہ لوگ عملاً اہل قتال بن جاتے ہیں۔ مثلاً بیمار یا زخمی کمانڈر جنگی چالیں بتا رہا ہو یا عورت جاسوسی یا تخریب کاری کر رہی ہو تو اس وقت وہ بھی اہل قتال کے حکم میں شامل ہو جائیں گے۔ پھر اہل قتال جن سے جنگ کرنا اور ان پر تلوار اٹھانا جائز ہے ان پر بھی غیر محدود حق حاصل نہیں ہے بلکہ اسلام نے اس کے بھی حدود و آداب کا تعین کیا ہے جن کی پابندی لازمی ہے۔ نہایت اختصار کے ساتھ ہم انہیں ذکر کرتے ہیں۔

اسلام میں طریقہ جنگ کی تطہیر و اصلاحات

اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ رات کو جب لوگ بے خبر سو جاتے، اچانک قتل و غارت گری شروع کر دیا کرتے۔ آنحضرت ﷺ نے اس وحشیانہ طرز کی اصلاح فرمائی۔ آپ جب کسی دشمن پر رات کے وقت پہنچ جاتے تو جب تک صبح نہ ہو جاتی حملہ نہیں فرماتے۔ اذا جاء قوماً بليل لم يغر عليهم حتى يصبح۔

۲۔ عربوں اور دیگر اقوام میں عام طور پر شدت انتقام میں دشمن کو زندہ جلا دینے کا رواج تھا۔ آنحضرتؐ نے اس وحشیانہ حرکت کو قطعاً ممنوع قرار دیا اور حکماً زندہ جلانے کی ممانعت فرما دی۔ لا تعذبوا بعذاب الله لا يعذب بالنار الا رب النار آگ میں جلانا صرف خدا کا حق قرار دیا۔

۳۔ دشمن کو باندھ کر قتل کرنا بھی معمول تھا۔ پیغمبر اسلامؐ نے دشمن کو باندھ کر تکلیفیں دے دے کر یا تڑپا تڑپا کر مارنے سے منع فرما دیا۔ ایک صحابی عبد الرحمن بن خالدؓ نے لاعلمی میں چار دشمنوں کو باندھ کر قتل کر دیا۔ جب انہیں اسلام کے حکم کا علم ہوا تو اپنی غلطی کے کفارے کے طور پر چار غلام آزاد کیے اور سخت نادم ہوئے۔

۴۔ میدان جنگ کے علاوہ لوٹ مار سے منع کر دیا۔ فتح خیبر کے وقت کچھ مسلمانوں نے مفتوح قوم کے ساتھ زیادتی شروع کر دی۔ آنحضرتؐ کو علم ہوا تو آپ نے اسی وقت سب کو جمع فرما کر اسلام کا حکم پہنچاتے ہوئے فرمایا: فتح کے بعد تمہارے لیے ہرگز جائز نہیں کہ بلاوجہ ان کے گھروں میں گھس جاؤ یا خواتین پر ہاتھ اٹھاؤ یا ان کے پھل کھا جاؤ۔ آپؐ نے اس حکم کو قرآن کی طرح بلکہ اس سے زیادہ واجب العمل قرار دیا۔

۵۔ دشمن کے مویشی چھین لینے سے اسلام نے روک دیا۔ ایک جنگی سفر کے موقع پر اسلامی لشکر نے کچھ بکریاں چھین کر ان کا گوشت پکا لیا۔ جب پیغمبر اسلام کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے آ کر پکے ہوئے گوشت کی دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا: النهبة ليست باحل من الميتة چھینا ہوا مال مردار کی طرح بدترین حرام ہے۔

۶۔ اس دور کا عام دستور تھا کہ جب فوجیں نکلتیں تو ساری منزل اور راستوں میں پھیل جاتیں اور راہ گیروں کے لیے راستے تنگ یا بند ہو جاتے۔ پیغمبر اسلامؐ نے منادی کرائی۔ من ضيق منزلا او قطع طريقاً فلا جهاد له یعنی جو کوئی منزل و راستوں کو تنگ کرے گا اور راہ گیروں کو لوٹے گا اس کا جہاد نہیں۔

فوجوں کو اخلاقی ہدایات کا رواج

انسانی تاریخ میں فوجوں اور لشکروں کو اخلاقی ہدایات دینے کا دستور آپ نے قائم فرمایا۔ جب آپ کسی لشکر کو روانہ فرماتے تو لشکر کو تقویٰ اور خدا کا خوف اختیار کرنے کی نصیحت کے بعد فرماتے:

اغزو بسم الله في سبيل الله قاتلوا من كفر بالله اغزو ولا تغدروا ولا تغلوا ولا تمثلوا ولا تقتلوا وليداً۔ جاؤ اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں لڑو ان لوگوں سے جو خدا سے کفر کرتے ہیں۔ جنگ میں کسی سے بدعہدی نہ کرنا، مال غنیمت میں خیانت نہ کرنا، مثلہ (اعضا کاٹنا) نہ کرنا اور کسی بچہ کو قتل نہ کرنا۔

اسی طرح خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب شام کی طرف فوجیں روانہ کیں تو ان کو دس ہدایات دیں جن کو تمام مورخین و محدثین نے نقل کیا ہے۔ وہ ہدایات یہ ہیں:

۱۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے قتل نہ کیے جائیں۔
۲۔ مثلہ نہ کیا جائے (یعنی جسم کے اعضاء نہ کاٹے جائیں)
۳۔ راہبوں اور عابدوں کو نہ ستایا جائے اور نہ ان کے معابد مسمار کیے جائیں۔
۴۔ کوئی پھل دار درخت نہ کاٹا جائے، نہ کھیتیاں جلائی جائیں۔
۵۔ آبادیاں ویران نہ کی جائیں۔
۶۔ جانوروں کو ہلاک نہ کیا جائے۔
۷۔ بدعہدی سے ہر حال میں احتراز کیا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۸۔ جو لوگ اطاعت کریں ان کی جان و مال کا وہی احترام کیا جائے جو مسلمانوں کی جان و مال کا ہے۔

۹۔ اموال غنیمت میں خیانت نہ کی جائے۔

۱۰۔ جنگ میں پیٹھ نہ پھیری جائے۔

ان احکامات کے ذریعے اسلام نے جنگ کو تمام وحشیانہ اور ظالمانہ افعال سے پاک کر دیا۔ اور جنگ کو ایک ایسی مقدس جدوجہد میں بدل دیا جس کے ذریعہ ایک نیک شریف اور بہادر آدمی کم سے کم ممکن نقصان پہنچا کر دشمن کے شرو فساد کو دفع کر کے امن قائم کر سکے۔

جنگ میں انسانی حقوق کی پاسداری کی تلقین

اس دور میں حالت جنگ میں دشمن قیدیوں کے قتل، عام عمارتوں کی توڑ پھوڑ، آتش زنی کے ساتھ ساتھ فصلوں اور کھیتوں کو برباد کر دینا بھی جنگ کی عام روایت تھی۔ قرآن نے فصلوں اور نسلوں کی بربادی و قتل کو فساد قرار دے کر اس کو ممنوع و حرام قرار دیا۔ (دیکھئے سورہ بقرہ آیت ۲۰۵)

البتہ جنگی ضرورت کے تحت درختوں کو کاٹنے کی اجازت ہے جیسا کہ بنی نضیر کے محاصرہ کے وقت کیا گیا۔ اس وقت بھی قرآن کی تصریح کے مطابق صرف ایک خاص قسم کے کھجور کے درخت جنہیں لینہ کہا جاتا تھا کاٹے گئے۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ بنی نضیر کھجوروں میں عجوہ و برنی بطور غذا استعمال کرتے تھے۔ لینہ ان کی غذا نہیں تھی۔ یہ کاٹنا بھی محاصرہ کو مضبوط بنانے کے لیے جنگی ضرورت کے تحت تھا۔ لہٰذا شرعاً ناگزیر حالات میں جنگی ضرورت کے لیے درخت کاٹے جا سکتے ہیں۔ محض دشمن کا نقصان کرنے یا تخریب و غارت گری کے لیے نہیں۔

اسی طرح عرب کا یہ دستور بھی تھا کہ دشمن کے قتل پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ جوش غضب میں اس کا مثلہ کیا جاتا یعنی کان، ناک اور دیگر اعضاء کاٹے جاتے۔ اسلام نے مثلہ کی سختی سے ممانعت کر دی اور دشمن کا صرف سر قلم کرنے پر اکتفا کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح قیدیوں کے متعلق قرآن نے صرف دو طرح کے سلوک کی اجازت دی۔ اما منا بعد و اما فداء یا تو احسان کا برتاؤ کر کے بلا معاوضہ رہا کر دو یا فدیہ (مالی معاوضہ) لے کر رہا کرو۔ البتہ قیدیوں میں جو شر و فساد کے ائمہ اور فتنہ عظیم اور قتل و غارت گری کے اصل ذمہ دار ہیں انہیں قتل کرنے کی اجازت ہے۔

اس دور میں سفیروں اور قاصدوں تک کو بے دریغ قتل کر دیا جاتا تھا خواہ وہ قاصد خود بادشاہ و وزیر ہی کیوں نہ ہو۔ اسلام نے مطلقاً قاصد کے قتل کو ممنوع قرار دیا۔ مسیلمہ کذاب کا قاصد عبادہ بن حارث جس نے پیغمبر اسلام کی خدمت اقدس میں نہایت گستاخانہ پیغام دیا تو آپ نے فرمایا: لولا ان الرسل لا تقتل لضربت عنقل اگر قاصدوں کا قتل (اسلام میں) ممنوع نہ ہوتا تو میں اسی وقت تیری گردن مار دیتا۔

فتح مکہ کے موقع پر جب اسلامی لشکر مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہا تھا (جہاں رسول اللہؐ اور آپ کے ساتھیوں کو ۱۳ سال تک شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا) آپؐ نے حکم دیا:

لا تجهزن علی جریح ولا یتبعن مدبر ولا یقتلن اسیرا من اغلق بابه فهو امن کسی زخمی پر حملہ نہ کیا جائے۔ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ امن میں ہے۔

اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کے اثرات

جنگ کے متعلق اسلام کی اس اصلاحی اور اعلیٰ تعلیم نے عرب کی جاہل وحشی اور خونخوار قوم جو کسی قانون یا اخلاقی ضابطہ کی قائل نہیں تھی ایسا زبردست ذہنی انقلاب پیدا کر دیا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے جو وحشی لٹیرے تھے اب دنیا میں بنی نوع انسان کی جان و مال عزت و آبرو کے محافظ بن گئے۔ اس کا سب سے بڑا نمونہ خود فتح مکہ ہے۔ ایک ایسا شہر جس نے پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے خاندان اور جانثار ساتھیوں پر اذیت رسانی، تکلیف دہی اور وحشیانہ ظلم و جور کے وہ تمام طریقے آزما لیے تھے جو انسانی بس میں ہو سکتے ہیں۔ مگر ان پر قابو پانے کے بعد نہ قتل عام کیا جاتا ہے نہ لوٹ مار ہوتی ہے، نہ کسی کے مال و عزت سے تعرض ہوتا ہے، پورے شہر کی تسخیر و فتح میں صرف وہی ۲۴ آدمی مارے جاتے ہیں جو خود پیش قدمی کر کے حملہ آور ہوتے ہیں۔ ہبار بن اسود جس نے پیغمبر اسلامؐ کی بے قصور جواں بیٹی کو بے رحمی سے شہید کیا، وحشی بن حرب جس نے آپؐ کے محبوب چچا کو قتل کیا، ہندہ بنت عتبہ جس نے پیغمبر اسلام کے چچا کے کان ناک کاٹے، کلیجہ نکال کر چبایا، سب سے بڑے دشمن ابو جہل کا بیٹا عکرمہ عبد اللہ بن سراح اور کعب بن زبیر جیسے پیغمبرؐ کے جانی دشمن تک کے قصور یک لخت معاف کر دیے جاتے ہیں۔ کیا اس کا ہزارواں حصہ بھی آج کی تہذیب کی علمبردار اور انسانی حقوق کی ٹھیکیدار مغربی اقوام پیش کر سکتی ہیں؟ یوں تو جنیوا کنونشن اور اقوام متحدہ نے حالت جنگ کے متعلق بڑے اچھے اچھے قوانین اور چارٹ بنا رکھے ہیں۔ لیکن اچھے اچھے الفاظ کا لکھ لینا اور چیز ہے اور عمل کار دیگر۔ کسی نے سچ کہا ہے ' اخلاق کہنے کی نہیں کرنے کی چیز ہے۔

حالت جنگ میں انسانی حقوق کی پاسداری کی چند مثالیں

اسلام نے حالت جنگ میں انسانی حقوق کے پاسداری کے لیے جو اصلاحات کیں پیغمبر اسلام نے کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی ان پر عمل کرنے کی درخشاں روایت قائم رکھی۔ اختصار کی خاطر صرف تین مثالیں پیش خدمت ہیں۔ اسلام کی پہلی فیصلہ کن جنگ بدر کے موقع پر کفار مکہ کے گیارہ سو کا لشکر جرار (جو جنگی ہتھیاروں سے پوری طرح مسلح تھا) کا مقابلہ محض تین سو تیرہ (۳۱۳) بے سروسامان اور نہتے مسلمانوں سے تھا۔ اس وقت ایک ایک شخص کی ضرورت و اہمیت تھی۔ ایسی حالت میں حضرت حذیفہ بن یمان اپنے والد کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ میدان جنگ میں پہنچتے ہیں اور بتاتے ہیں ہمیں راستے میں دشمنوں کے
لشکر نے روک لیا تھا۔ مجبوراً ہمیں یہ وعدہ کرنا پڑا کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر ان
کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ آپ ہمیں ایسے اہم اور فضیلت کے موقع پر جنگ
میں حصہ لینے کی اجازت دیں۔ مگر پیغمبر اسلامؐ نے اجازت نہیں دی اور ابوجہل
جیسے سخت دشمن اسلام سے مجبوری کے عالم میں کیے ہوئے عہد کو پورا کرنے کا حکم
دیا۔ اسی طرح جنگ خیبر کے موقع پر جب دشمنوں (یہود) کا سخت محاصرہ کے
دوران قلعہ سے ایک چرواہا ان کی بکریاں چرانے کے لیے نکلتا ہے اور
آنحضرت سے سوال و جواب کے بعد مسلمان ہو جاتا ہے تو آنحضرتؐ اسے
پہلا حکم یہ دیتے ہیں کہ اہل خیبر (اسلام کے شدید دشمن اور حالت جنگ میں
ہیں) کی بکریاں واپس کر کے آؤ۔ اور آگے بڑھیے حضرت معاویہؓ جو آپؐ
کے صحابی اور تمام مسلمانوں کے خلیفہ ہیں' بلاد روم یعنی اہل یورپ سے معاہدہ
کرتے ہیں' آپ صلح کی مدت ختم ہوتے ہی اچانک حملہ کرنے کے لیے اسلامی
فوجوں کو اپنی سرحد پر جمع کرنا چاہتے ہیں تو ایک صحابی حضرت عمرو بن عبسہؓ اس
کو بدعہدی سے تعبیر کرتے ہوئے پکار کر کہتے ہیں اللّٰہ اکبر وفاء لا غدراً
فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ نے حکم دیا ہے کہ جس کسی قوم (دشمن) سے معاہدہ
ہو اس میں اتنی سی بھی خیانت نہ کی جائے (کہ دشمن سمجھے کہ اگر حملہ ہوا تو
مسلمانوں کا لشکر مرکز سے چل کر اتنے دنوں میں سرحد تک پہنچے گا' اس لیے
اسے پہلے معاہدہ کے ختم کرنے کا نوٹس دیا جائے۔) اس پر حضرت معاویہؓ
لشکر سرحد سے واپس بلا لیتے ہیں۔ کیا دنیا کی کوئی قوم بشمول مغرب کے
حالت جنگ میں عہد کی پاسداری کی ایسی ایک مثال بھی پیش کر سکتی ہے؟ کیا
مغرب کی مہذب کہلانے والی اقوام حالت جنگ میں دشمن کے ساتھ ایسے
اخلاقی برتاؤ کا تصور بھی کر سکتی ہے؟ ان انسانی حقوق کے ٹھیکیداروں کا یہ حال
ہے کہ حالت جنگ میں نہیں (سرد جنگ میں) لیبیا و ایران کے مسافر بردار
طیاروں کو مار گراتی ہے۔ عراق' ایران' لیبیا کے کھربوں ڈالر کے بینک
اثاثوں کو فریز کر کے بے دھڑک ہضم کر جاتی ہے اور ان کا ضمیر ذرہ برابر شرم و
حیا محسوس نہیں کرتا۔

انسانی حقوق کی پاسداری میں مغربی اقوام اور مسلمانوں کا موازنہ

مسلمانوں کا حالت جنگ میں انسانی حقوق کی پاسداری کا ریکارڈ اتنا
شاندار ہے کہ محمد رسول اللہؐ اور آپ کی تربیت یافتہ جماعت سینکڑوں جنگیں
کرتی ہے۔ نصف سے زیادہ دنیا فتح کرتی ہے مگر کوئی ثابت نہیں کر سکتا' ان عظیم
الشان فتوحات اور مسلسل جنگوں میں کبھی کسی عورت' بچے یا بوڑھے پر ہاتھ اٹھایا
ہو۔ اس کے برخلاف اس صدی میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں تہذیب و
تمدن کی دعوے دار مغربی اقوام نے جو خود کو انسانی حقوق کی چیمپئن کہتی ہیں ایک
دوسرے کے ملک میں گھس کر جو تباہیاں پھیلائیں اور کروڑوں بے قصور شہریوں
کو جن بھیانک طریقوں سے ہلاک کیا' دشمن (جرمنی و جاپان) کے ہتھیار

ڈالنے کی موثق اطلاعات کے باوجود محض اپنی ہیبت و طاقت کے مظاہرہ کے لیے
(ہیروشیما پر ایٹم بم ڈال کر) جنگ کے اختتام کا وحشیانہ طریقہ اختیار کیا۔ اس
سے کون ناواقف ہے۔ حال ہی میں بوسنیا اور کوسوا میں مغرب کے سرب
درندوں ہی نے نہیں بلکہ اقوام متحدہ کے محافظ دستوں میں شامل امریکہ' یورپ
کے فوجیوں نے ہزارہا مسلمان خواتین کے ساتھ جو کچھ کیا وہ طشت از بام ہو چکا
ہے۔

جنگ میں اسلام کے اصلاحی اقدامات، کے ثمرات ونتائج

جنگ میں انسانی حقوق کے متعلق اسلام کی عطا کردہ اعلیٰ اخلاقی تعلیمات
کا نتیجہ اور اس کی برکت تھی کہ چند ہی سالوں میں نہ صرف جزیرۃ العرب و مشرق
وسطیٰ کے ممالک بلکہ ایشیاء افریقہ کا بڑا حصہ اسلام کے سایہ عاطفت میں پناہ
گزین ہو گیا۔ یہ اقوام اتنی سرعت سے اسلام کی طرف آئیں کہ مورخین محو
حیرت ہیں۔ ہم نہایت اختصار سے سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں۔

عہد نبوی میں کل لڑائیوں (غزوات و سرایا) کی مقدار ۸۲ ہے جس کے
نتیجہ میں تقریباً دس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا اور اس میں ایسا امن و امان قائم
ہوا کہ مملکت کے آخری کنارے حیرہ (یمن) سے ایک حسین عورت سونے کے
زیورات سے لدی نکلتی ہے اور بیت اللہ کا طواف کر کے واپس آ جاتی ہے۔
ہزارہا میل کے طویل سفر میں کوئی متنفس اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں
دیکھتا۔ اس قدر عظیم اخلاقی و ذہنی انقلاب کے لیے طرفین کا جو جانی نقصان ہوا
وہ یہ ہے۔ کل مسلمان شہید ہوئے ۲۵۹ اور کل غیر مسلم قتل ہوئے ۷۵۹۔
دس سالہ جنگوں میں کام آنے والے مسلم و غیر مسلم کا کل میزان ۱۰۱۸ بنتا ہے۔
آج اتنے انسان تو معمولی جھڑپوں میں ہلاک کر دیے جاتے ہیں۔

اور آگے بڑھیے' دور فاروقیؓ میں ۲۲ لاکھ مربع میل' دور عثمانی میں ۴۴
لاکھ مربع اور دور معاویہؓ میں تقریباً ۶۵ لاکھ مربع میل کا علاقہ یعنی اس دور کی
معلوم دنیا (ایشیا افریقہ و یورپ) کے بڑے حصہ پر اسلام کی عملداری قائم ہو
جاتی ہے۔ اس میں صرف تیس (۳۰) سال کا عرصہ لگتا ہے اور آدھی سے
زیادہ دنیا کو فتح کرنے میں جانی نقصان اس قدر کم ہوتا ہے کہ اس پر آج تک
مورخین محو حیرت ہیں۔ اس کے برعکس انسانی حقوق کی علمبردار مغربی اقوام نے
گزشتہ نصف صدی میں جس قدر انسانوں کو قتل کیا اس پر بھی ایک نظر ڈالیں۔
الجزائر میں فرانس نے تقریباً دس لاکھ' صرف ویت نام میں امریکہ نے ۱۴ لاکھ'
لیبیا میں اٹلی نے تقریباً ساڑھے تین لاکھ' افغانستان میں روس نے تقریباً ۱۵
لاکھ' دونوں جنگ عظیم میں مغربی اقوام نے تقریباً ڈیڑھ کروڑ' روس اور چین
کے کمیونسٹ انقلاب میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا میں
کوئی بڑی جنگ نہ ہونے کے سبب اسے سرد جنگ یا امن کا دور کہا جاتا ہے۔ مگر
اس سرد جنگ کے دوران گزشتہ ساٹھ سالوں میں جنگوں میں ہلاک ہونے
والے لوگوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقریباً اتنی ہی تعداد وطن سے ہجرت پر مجبور ہونے والوں کی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جنگوں میں مرنے اور ہجرت کرنے والوں میں تقریباً نصف کے قریب مسلمان ہیں۔ تازہ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت دنیا میں ۷۵ ملین مہاجرین ہیں جن میں ۳۲ ملین مسلمان ہیں۔ یعنی گزشتہ ساڑھے تیرہ سو سالوں میں اتنے مسلمان قتل نہیں ہوئے جتنے مغرب کے عطا کردہ امن کے ساٹھ سالوں میں۔ کہیں یہ فریضہ جہاد کو چھوڑنے کی سزا تو نہیں؟

دنیا سے جنگوں کے خاتمہ اور انسانی حقوق کی بحالی کا واحد طریقہ

نزول قرآن کے وقت دنیا کو امن کی جس قدر ضرورت تھی آج پھر دنیا کو امن کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ پوری دنیا تباہی کے کنارے پر پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا سے جنگیں اور فساد کبھی اخلاقی وعظ و نصیحت سے ختم نہیں ہوا۔ سقراط سے ایک بار پوچھا گیا' انسان کو جنگوں سے نجات مل سکے گی؟ اس کا جواب تھا جنگیں اس وقت تک ناگزیر رہیں گی جب تک انسان دیوانگی میں مبتلا رہے گا۔ اس پر لوگوں نے سوال کیا' اور انسان کب تک دیوانگی میں مبتلا رہے گا؟ سقراط کا جواب تھا "ہمیشہ" ۔ امن کے شہزادے (حضرت عیسیٰ ؑ) کا اعلان تھا وہ دنیا کو امن نہیں تلوار دینے آیا ہے۔ فنلے (Finly) لکھتا ہے: "عیسائیت نے اہنسا کا خوشنما مژدہ ضرور سنایا مگر اس پر کبھی کسی رومی شہنشاہ نے عمل کیا نہ مذہبی پادریوں اور پوپ نے" آج بھی مسیحی دنیا کی ذہنی صلاحیت اور مادی وسائل کا بڑا حصہ دنیا کی تباہی و ہلاکت کے ذرائع کی ایجاد میں صرف ہو رہا ہے۔ یہی حال اہنسا کے علمبردار بھارت کا ہے۔ اہنسا کا تصور ہمیشہ ناقابل عمل رہا ہے۔ مشہور آسٹریلوی مدبر آر جی کیسے (R.G. Case) مسٹر گاندھی کے نظریہ عدم تشدد پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے: "یہ تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ میں دوسروں کے خلاف تشدد نہ کروں لیکن میں دوسروں کو اپنے خلاف تشدد سے کیسے باز رکھ سکتا ہوں؟"

اسلام نے دنیا سے ظلم اور جنگوں کو ختم کرنے کے لیے ہی تلوار اٹھانے کا حکم دیا ہے۔ جیسے کوئی ماہر جراحت سرجن نشتر لے کر آپریشن روم میں جاتا ہے۔ اسلام کا فلسفہ امن یہ ہے کہ طاقت اور ہتھیار نفس و خواہش پرست جنگ کے دلدادہ لوگوں کے بجائے انسانی حقوق کے پاسبان و محافظ جہاد کا تصور رکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہو۔ انسانی تاریخ شاہد ہے' دنیا میں امن صرف اسی وقت قائم ہو سکا جب تلوار خوف خدا رکھنے والوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ماضی کی طرح مستقبل میں جب بھی دنیا میں صحیح معنی میں امن قائم ہوگا وہ اسلام کے ارفع فلسفہ امن یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ ہی ہوگا۔

ورلڈ اسلامک فورم کا سالانہ اجلاس

ورلڈ اسلامک فورم کی مرکزی کونسل کا سالانہ اجلاس ۸ نومبر ۲۰۰۰ء کو جامعۃ الہدیٰ نوٹنگھم (برطانیہ) میں مولانا محمد عیسیٰ منصوری کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں دیگر ارکان کے علاوہ مولانا زاہد الراشدی نے بھی شرکت کی۔ اجلاس میں ورلڈ اسلامک فورم کی سرگرمیوں کو از سر نو منظم اور تیز کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور آئندہ دو سال کے لیے فورم کے مندرجہ ذیل تنظیمی ڈھانچے کی منظوری دی گئی۔

چیئرمین	مولانا محمد عیسیٰ منصوری	لندن
ڈپٹی چیئرمین	مولانا مفتی برکت اللہ	لندن
سیکرٹری جنرل	مولانا رضاء الحق سیاکھوی	نوٹنگھم
رابطہ سیکرٹری	بیرسٹر منصور ملک	لندن

ارکان مرکزی کونسل (۱) مولانا زاہد الراشدی (پاکستان) (۲) ڈاکٹر اختر الزمان غوری (برمنگھم) مولانا محمد قاسم رشید (کرائیڈن) (۴) حاجی افتخار احمد (لندن) (۵) مولانا محمد قاسم (برمنگھم) (۶) مولانا قاری محمد عمران خان جہانگیری (لندن) (۷) مولانا مشفق الدین (لندن) (۸) حافظ حفظ الرحمٰن تاراپوری (لندن) (۹) ڈاکٹر نذر الاسلام بوبی (لندن) (۱۰) فیض اللہ خان (لندن) (۱۱) حاجی غلام قادر (لندن)

اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ اسلام اور مغرب کی موجودہ تہذیبی کشمکش کے پس منظر میں اسلامی ثقافت کے تحفظ اور دعوت اسلام کے فروغ کے لیے باہمی رابطہ و مفاہمت کو فروغ دیں اور اسلام کو درپیش جدید فکری و علمی چیلنجز کا ادراک کرتے ہوئے نئی نسل کو ان کے مقابلہ کے لیے تیار کریں۔

ایک اور قرارداد میں بیت المقدس پر اسرائیل کے مسلسل قبضہ اور فلسطینی عوام پر روز افزوں تشدد کی مذمت کرتے ہوئے دوحہ کی مسلم سربراہ کانفرنس کے اعلانات کا خیر مقدم کیا گیا ہے اور مسلمان حکومتوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ بیت المقدس کی بازیابی اور فلسطینی عوام کے جائز حقوق کی بحالی کے لیے مشترکہ لائحہ عمل تیار کریں اور آزاد فلسطینی ریاست کے قیام کی بھرپور حمایت کی جائے۔

ایک قرارداد میں افغانستان کی طالبان حکومت کے خلاف عالمی پابندیوں کو ناروا قرار دیتے ہوئے دنیا بھر کی مسلمان حکومتوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ طالبان حکومت کو تسلیم کریں اور افغانستان کی تعمیر نو کے لیے طالبان حکومت کی بھرپور امداد کی جائے۔

ایک قرارداد میں اقوام متحدہ کے موجودہ کردار کو جانبدارانہ قرار دیتے ہوئے مسلمان حکومتوں سے اپیل کی گئی ہے کہ وہ مسلم ممالک کے متحدہ بلاک کی تشکیل کے لیے پیش رفت کریں اور اقوام متحدہ کے ارکان مسلم ممالک مشترکہ دباؤ کے ذریعہ اقوام متحدہ میں اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لیے عملی اقدامات کریں اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اقوام متحدہ سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم ممالک کی الگ اقوام متحدہ تشکیل دی جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا محمد عبد المنتقم سلہٹی

انسانی حقوق کے مغربی تصورات اور سیرت طیبہ

آج کی دنیا میں انسانی حقوق کی زبان' سب سے زیادہ توجہ کے ساتھ سنی جاتی ہے اور انسانی حقوق کے حوالے سے کی جانے والی گفتگو' سب سے زیادہ موثر گفتگو سمجھی جاتی ہے۔ لیکن عام طور پر انسانی حقوق کا ایک ایسا صاف اور واضح تصور ذہنوں میں موجود نہیں ہے کہ جس سے قابل تحفظ حقوق کے تعین کی کوئی بنیاد فراہم ہوتی ہو اور حقوق و فرائض کے درمیان حد فاصل قائم کرنے کی کوئی اساس مہیا ہو سکے۔ اس کھوکھلے پن کا نتیجہ یہ ہے کہ عقلی سوچ اور ذہنی تخیل کی روشنی میں انسانی حقوق کا کوئی خاکہ متعین کر لیا جاتا ہے اور اسی کو معیار حق قرار دے دیا جاتا ہے اور پھر اسی خود ساختہ معیار پر ہر چیز کو پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ انسانی حقوق کے تعین میں اگر عقل کی بالادستی کو تسلیم کر لیا جائے تو حقوق کے تعین کی کوئی بنیاد فراہم نہیں ہوتی' کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک انسانی حقوق کے بارے میں تصورات بدلتے چلے آئے ہیں۔ ایک دور میں انسان کے لیے کسی حق کو لازمی سمجھا گیا اور دوسرے دور میں اسی حق کو ناحق قرار دیا گیا۔ مثال کے طور پر نبی کریم سرور دو عالم ﷺ جس وقت دنیا میں تشریف لائے' اس وقت انسانی حقوق ہی کے حوالے سے یہ تصور پھیلا ہوا تھا کہ جو شخص کسی کا غلام بن گیا' تو نہ صرف اس کے جان و مال مملوک ہو گئے بلکہ آقا کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ جس طرح چاہے غلام کو استعمال کرے' چاہے گردن میں طوق پہنائے' اور چاہے پاؤں میں بیڑیاں ڈالے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے فاشزم نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ جو طاقتور ہے' اس کا ہی بنیادی حق ہے کہ وہ کمزور پر حکومت کرے اور کمزور کے ذمہ واجب ہے کہ وہ طاقت کے آگے سر جھکائے۔

ذرا غور فرمایئے۔ غلامی کے جس تصور کو آقا کا بنیادی حق قرار دیا جاتا تھا' اسی کو آج جاہلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کمزور پر جس حکمرانی کو طاقتور کا یکطرفہ حق سمجھا گیا' اسی کو بعد میں نہ صرف یہ کہ بدترین ظلم کے عنوان سے تعبیر کیا گیا بلکہ فاشزم کا نام خود گالی بن گیا ہے۔ انسانی حقوق کے تصورات کی اس تاریخی حقیقت کے پیش نظر یہ سوال بجا طور پر ذہن میں ابھرتا ہے کہ آج جن حقوق کو عقل کے فیصلہ پر انسانی حقوق کہا جا رہا ہے' ان کے بارے میں کیا ضمانت ہے کہ وہ کل بھی تسلیم کیے جائیں گے اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور وہ کونسی بنیاد ہے' جو اس فیصلہ کو حرف آخر قرار دے سکے گی؟

یہ وہ نازک سوال ہے جس کا حل پیش کرنے سے عقل انسانی عاجز ہے' کیونکہ عقل' حواس خمسہ کی طرح ایسا ذریعہ علم ہے جس کا دائرہ کار ایک مخصوص حد میں جا کر ختم ہو جاتا ہے' جیسا کہ حواس خمسہ میں سے ہر ایک کی پرواز ایک متعین حد میں رک جاتی ہے۔ مثال کے طور پر' ایک گھر کو آنکھوں سے دیکھ کر یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ لیکن صرف آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھو کر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس گھر کو کس انسان نے بنایا ہے' بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ پھر آگے چل کر جو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس گھر کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے؟ کس کام میں استعمال کرنے سے فائدہ ہو گا اور کس میں استعمال کرنے سے نقصان ہو گا؟ اس سوال کا حل پیش کرنے سے عقل بھی ناکام ہو جاتی ہے۔ یہ اور اس قسم کے سوالات کا جواب دینے کے لیے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے' اس کا نام "وحی" ہے۔ وحی انسان کے لیے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے زندگی سے متعلق ان سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعہ تو حل نہیں ہو سکتے لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لیے ضروری ہے' اس لیے عقل اور مشاہدہ کا محدود دائرہ اثر ختم ہو جانے کے بعد وحی الٰہی کے شفاف چشمہ حیات سے رہنمائی حاصل کرنا ایک ناگزیر ضرورت ہے' ورنہ انسانیت' منزل مقصود کی راہ سے کوسوں دور چلی جاتی ہے اور ہر وقت مصائب و مشکلات کے صحراء میں بھٹکتی پھرتی ہے' لیکن اپنے سفر حیات کا وہ نشان راہ اسے نظر نہیں آتا جو منزل مقصود تک پہنچتا ہو۔

انسانی حقوق کے حوالے سے جو تصورات آج مغرب کی طرف سے پھیلائے جا رہے ہیں' ان کی بنیاد بھی نری عقل پر ہے' جس کا نتیجہ آج مغرب میں معاشرتی بگاڑ' جنسی انارکی اور فیملی سسٹم کی تباہی کے جس خوفناک روپ میں ظاہر ہو رہا ہے اس نے خود مغربی دانشوروں کو حیران و ششدر کر دیا ہے۔

ان حقائق کے پس منظر میں اگر انسانی حقوق سے متعلق قرآن کریم کی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات و احکام کو سامنے لایا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انسان حقوق کے تعین اور تحفظ کا جو معیار اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ﷺ نے آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے وحی الٰہی کے سرچشمہ فیض سے پیش کیا تھا اور حقوق و فرائض کے درمیان جو خط امتیاز انہوں نے قائم فرمایا [illegible] عقل [illegible] ترقی کے تمام مراحل طے کرنے اور مختلف نظام ہائے زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا تجربہ کرنے کے باوجود اس کا متبادل سامنے نہیں لا سکی۔ سرکار دو عالم ﷺ کا انسانی حقوق کے سلسلے میں سب سے بڑا کنٹری بیوشن (Contribution) یہ ہے کہ آپ نے قابل تحفظ حقوق کے تعین کی وہ بنیاد انسانیت کے سامنے پیش کی جو ایک ایسی اتھارٹی کی طرف سے عطا فرمائی گئی ہے جس کا علم کامل' کائنات کے ایک ایک ذرہ پر محیط ہے اور جو انسانوں کا بھی خالق و مالک ہے' اور ان کی وسیع تر ضروریات کے بارے میں بخوبی واقف ہے' اسی قادر مطلق ذات نے اپنی حکمت بالغہ سے "وحی" کی صورت میں جو خالص اور قطعی علم اپنے آخری نبی ﷺ پر نازل فرمایا' وہی علم حقیقی' انسانی حقوق کے تعین کے لیے واحد بنیاد اور منفرد معیار ثابت ہو سکتا ہے' لیکن مغرب نے وحی الٰہی کی جگمگاتی ہوئی روشنی سے راہ نجات تلاش کرنے کے بجائے انسانی حقوق کے تعین و تحفظ کے لیے عقل کو نگران مقرر کیا اور اس پہلو پر غور نہ کیا کہ عقل کی کمزور لگام' خواہشات کے منہ زور گھوڑے کو کنٹرول کرنے میں ہمیشہ ناکارہ ثابت ہوئی ہے۔ اور انسانی خواہشات نے صرف اس وقت فطرت کے دائرے میں رہنا قبول کیا جب ان پر وحی الٰہی کی حکمرانی قائم ہوئی ہے۔ اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز کر کے جو خمیازہ مغرب کو بھگتنا پڑ رہا ہے' اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے ہو سکتا ہے' مغرب نے اپنی "خواہش پرست عقل" کے فیصلہ پر یہ تصور پیش کیا کہ مرد و عورت' جس درجہ کے اختلاط پر باہم رضامند ہوں اس پر کسی تیسرے کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ دیکھیے! یہاں مغرب نے مرد اور عورت کے باہمی رضامندی تو دیکھ لی' مگر پورے معاشرے پر اس اختلاط کے اثرات کو نہ دیکھ سکا' جس کے نتیجے میں ناجائز بچوں کے تناسب میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور خاندانی نظام تباہی کی آخری حدود کو چھو رہا ہے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ نے وحی کی بنیاد پر مرد و عورت کی اس باہمی رضامندی کو بھی جرم قرار دیا ہے' جو معاشرے کے لیے منفی نتائج کا باعث بن سکتی ہو۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مرد و عورت کے باہمی اختلاط کے لیے رشتہ ازدواج کے فطری اور پرمسرت تعلق کو جائز رکھا اور باقی ہر قسم کے میل جول سے منع فرما دیا۔ اسی طرح سود کے بارے میں مغرب نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ جب سود دینے اور لینے والے آپس میں متفق ہیں تو پھر تیسرے کسی کو حق اعتراض حاصل نہیں ہونا چاہیے' یہاں بھی مغربی عقل نے اپنی کرشمہ سازی دکھائی اور حقوق کے تعین میں صرف دو افراد کی رضامندی کو بنیاد بنایا جبکہ حضور اکرم ﷺ نے معاشرے پر بحیثیت مجموعی سود کے منفی اثرات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی حرمت کا اعلان فرمایا۔ آج سودی معیشت کے نتیجے میں جس طرح چند مخصوص گروہوں کی اجارہ داری کے شکنجے میں پوری دنیا کے انسان کسے جا رہے ہیں اس سے اسلامی تعلیمات کی صداقت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مغرب' جس طرح انسانی حقوق کے تعین میں غلطاں و پیچاں ہے' اسی طرح حقوق و فرائض میں توازن قائم کرنے اور ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنے میں بھی وہ ناکام رہا ہے۔ مغرب نے حقوق و فرائض کو آپس میں ایسا خلط ملط کر دیا کہ ان کے درمیان کوئی خط امتیاز قائم نہ رہا' لیکن وہ اپنے اس ...

پروپیگنڈہ اس زور و شور سے کر رہا ہے کہ آج کا معاشرہ انسانی حقوق کے بارے میں مسلسل ذہنی انتشار اور فکری بے راہ روی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔

مثلاً حلال روزگار کے ذریعہ اہل خانہ کی کفالت کرنا رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کی رو سے فرائض کا حصہ ہے' جو گھر کے سربراہ پر عائد ہوتا ہے۔ مگر مغرب نے روزی کمانے کے فریضے پر "حقوق" کا خوشنما لیبل چسپاں کر دیا' اور اس طرح عورت کو مردوں کے شانہ بشانہ "مساوی حقوق" دینے کے لیے ورغلایا۔ اس دلچسپ نعرے سے عورت بیچاری بہت متاثر ہوئی اور یہ سمجھ کر خوش ہو گئی کہ اب میں مساوی حق سے بہرہ ور ہو رہی ہوں لیکن حقوق و فرائض کے اس گڈمڈ فلسفہ نے نتائج و ثمرات کے لحاظ سے آج جو روپ دھار لیا ہے' اس نے گورباچوف جیسے مدبر کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم نے عورت کو گھر سے نکال کر غلطی کی ہے اور اب اسے گھر واپس لے جانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا۔

رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات کی رو سے حکومت و اقتدار ایک نازک ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کی سنگینی اور نزاکت کے بارے میں آپ نے قدم قدم پر خبردار کیا ہے' جس کا خوشگوار ثمرہ' حکمرانوں میں احساس ذمہ داری اور خدا خوفی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور لوگ اقتدار کی دوڑ میں شریک ہونے کے بجائے اس سے بچنے میں عافیت محسوس کرنے لگے۔ مگر مغرب نے اقتدار کو حقوق انسانی کی فہرست میں شامل کیا' جس کا منطقی انجام حکمرانوں میں خود غرضی' نفس پروری اور ہوس پرستی کی ہولناک صورت میں سامنے آیا اور لیلائے اقتدار تک پہنچنے کے لیے ہر جائز و ناجائز حربے کو زینہ بنا لیا گیا۔

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ مغرب نے نہ انسانی حقوق کے تعین کی کوئی بنیاد فراہم کی' اور نہ حقوق و فرائض کے درمیان کوئی خط امتیاز قائم کیا جس کے نتیجے میں انسانی معاشرہ کو فکری اور عملی دونوں اعتبار سے تباہی و بربادی کا سامنا ہے۔ جبکہ حضور ﷺ نے انسانی حقوق کی حقیقی بنیاد فراہم کی' اور انسانیت کو وحی الٰہی کے شفاف اور خوش ذائقہ چشمہ حیات کی طرف رہنمائی فرمائی۔

انڈونیشیا کے صوبہ آچے میں شریعت نافذ کر دی گئی

لندن (ٹی وی رپورٹ) انڈونیشیا کے صوبے آچے کے گورنر عبد اللہ نے صوبے میں شریعت نافذ کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ بی بی سی کے مطابق انہوں نے کہا کہ صدر عبد الرحمن واحد آچے میں شرعی قوانین کے اطلاق کا افتتاح اس ہفتے کے آخر میں کریں گے۔

(روزنامہ جنگ لاہور ۵ دسمبر ۲۰۰۰ء)

© rasailojaraid.com